سید عابد علی عابد
ترجمہ۔ سید سجاد رضوی

حافظ شیرازی

(۴)

حافظ کے ہاں صوفیانہ رنگ بھی صحیح معنوں میں موجود نہیں بلکہ وہ بھی ایک قسم کی راہِ فرار ہے کسی نقاد نے حافظ کو ایک ایسے صوفی کی حیثیت نہیں دی جو تہذیبِ نفس کی ان منازل سے گذرا ہو جو انسان کو تصوّف کے رموز و غوامض اور واردات سے آشنا کراتی ہیں۔ وہ تصوّف کی مصلحات سے کھیلتا ہے اور اپنے اشعار کو ایک ایسا ذو معنی رنگ دے دیتا ہے جس کی بنا پر عشق بازی اور عشق حقیقی دونوں کے پرستار حافظ کے کلام کی تفسیر اپنے نقطۂ نظر سے کر سکتے ہیں۔ حافظ کے بہت سے اشعار کی تعبیر فقط تصوف کے نقطۂ نظر ہی سے ہو سکتی ہے لیکن ان میں بھی اس جذباتی گرمجوشی کا ثبوت نہیں ملتا جو رومی، عطار اور سنائی کا مابہ الامتیاز ہے۔

یہ تو تھی حافظ کی تصویر بحیثیت انسان کے جہاں تک ان کی فنکارانہ حیثیت کا تعلق ہے حافظ کے ہاں ان واردات و محاکات کا سراغ نہیں ملتا جو صحیح معنوں میں ایک اعلیٰ درجہ کے متصوف شاعر کے ہاں دستیاب ہوتی ہیں اور جو اس قابل ہوتی ہیں کہ انسان پر ایک وجد کی کیفیت طاری کر دیں۔ لیکن حافظ کا اسلوب نہایت پاکیزہ ہے اور اس کے ہاں ایک ایسا رنگ ملتا ہے جس کی بنا پر وہ دلدادگانِ غزل کا محبوب بن جاتا ہے:

حسد چہ می بری ای سست نظم در حافظ
قبولِ خاطر و لطفِ سخن خداداد است

اپنے دائرے میں حافظ یکتا ہے۔ اس کی بنیادی خصوصیت احتساسیت ہے۔ اس کی تشبیہات و استعارات نہایت روشن ہوتی ہیں اور نہایت خوبی سے تشریح مطالب کرتی ہیں۔ اس کے اندازِ نگارش کی موزونیت اور تناسب اس کا ترنم اور نغمۂ قاری پر ایک خواب آور اثر ڈالتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو حافظ کی تعمیر کردہ دنیائے خواب و خیال میں پاتا ہے۔ جہاں ہم مشرب دوستوں کی محفلیں ہیں۔ جام و مینا کے ہنگامے ہیں۔ خوبانِ دلآرا ہیں اور غزل گوئی کے چرچے ہیں، (خوب صورت مجلد صفحے ہیں) اسی دنیا میں وہ آبِ رکنا باد کو آہستہ خرام محسوس کرتا ہے اور بادِ نسیم حافظ کے محبوب باغِ مصلی کی روشوں پر اٹکھیلیاں کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ یہ درحقیقت شعبدہ کاری ہے اور یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن میں حافظ کو ان لوگوں کا سرگروہ قرار دیا ہے جو اپنے قارئین کو منشیات

پلا کر فساد و انحطاط اور موت کی وادیوں میں لے جاتے ہیں۔ حافظ تقدیر کا ذکر اس خوبصورتی سے کرتا ہے، انسانی کاوشوں کی بے ثمری اس انداز سے بیان کرتا ہے اور اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دینے کی ترغیب اتنے پیارے انداز میں دلاتا ہے کہ اس کے قاری حافظ کے دعاوی کو جانچنے کے لئے اپنی عقل سے کام نہیں لیتے۔ انہیں تھپکیاں دے دے کر ایک گہری نیند سلا دیا جاتا ہے۔ یہ نیند ذہنی اور جسمانی بے عملی کی آئینہ دار ہوتی ہے انسان کو خبر بھی نہیں ہوتی اور وہ عمرانی موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ کلام حافظ کے نیم اخلاقی اور عاشقانہ مطالب کی مانند ان کے صوفیانہ خیالات بھی اسی قسم کی خواب آور کیفیت کے حامل ہیں۔ ان کا تصوف بنیادی طور پر وحدت الوجود پر مبنی ہے اور وہ اس دنیا اور اس کے تمام علائق کو فریبِ نظر (مایا) کی کرشمہ سازیاں تصوّر کرتے اور اسی لئے ترک دنیا (تیاگ) کے تصوّر پر بڑا زور دیتے ہیں۔ اسلام نے جو راہ انسان کے لئے معین کی ہے اس کے مطابق اس عالم کی تسخیر اور اپنی ایغو کی ترقی اور تعمیر کے وسیلہ سے بقا کا حصول اس کے لئے مقدر ہے، لیکن حافظ یہ بیان کرتے ہیں کہ نوعِ انسان کی منزل آخر نروان[1] یا فنا ہے جس سے مراد فنائے ذات[2] ہے۔ یہ بات اسلامی تعلیمات کی نفی کرتی ہے۔ مسلمانوں کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ اس دنیا میں پھلیں پھولیں اور اس کے ثمرات سے بہرہ یاب ہوں لیکن حافظ مانی[3] کے راستہ پر چلتے اور اس بات کا پرچار کرتے ہیں کہ صرف وہی لوگ ساحل نجات تک پہنچ پاتے ہیں جو تمام علائق دنیوی سے کنارہ کشی اختیار کر لیں۔

اسی لئے اگر اقبال نے حافظ کے متعلق یہ شعر کہے تو وہ کافی حد تک حق بجانب تھے:

ہوشیار از حافظِ صہباگسار جامش از زہرِ اجل سرمایہ[4] دار
چوں خراب از بادۂ گلگوں شود مایہ دارِ حشمت قاروں شود
آں فقیہ ملّتِ میخوارگاں آں امامِ امت بیچارگاں

---

۱ ایرانی تصوف میں نروان کے لئے فنا کا لفظ ہے جو ایک ایسی روحانی آسودگی کی حالت ہے جس میں زندگی اور اس کے متعلقات کی نفی اور ان کا ترک لازم آتا ہے۔

۲ ذات کو بعض اوقات جان بھی کہا جاتا ہے: جاں بود میانِ دے و جاناں حائل
فی الحال کہ جاں داد بجاناں پیوست

یہاں جاناں جان کی جمع ہے جو خدا کے لئے استعمال ہوا۔

۳ مانی ایک ایرانی مفکر ہے جو ثنویت کے عظیم ترین ستونوں میں شمار ہوتا ہے۔

۴ دیکھئے باقیات اقبال از عبدالوحید صفحہ ۱۸۵۔ اور حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں از عبداللہ قریشی مجلہ اقبال اکتوبر ۱۹۵۳ء

مارِ گلزاری کہ دارد زہر ناب صید را اوّل ہمی آرد بخواب
بے نیاز از محفلِ حافظ گزر الحذر از گوسفنداں الحذر

۷۸۶ھ میں شاہ شجاع کی وفات کے بعد خاندانِ مظفریہ کے بُرے دن آگئے اور امیر تیمور نے ان کے علاقہ کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کی ٹھان لی ۷۸۹ھ میں اس نے ایران پر حملہ کیا اور اصفہان میں قریباً ستّر ہزار آدمیوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ ۷۹۵ھ میں وہ دوبارہ آیا اور خاندانِ مظفریہ کے ایک آخری اور جرأت مند شہزادہ شاہ منصور کو قتل کر ڈالا۔ دستور کے مطابق شاہی خاندان کے تمام مردوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تہ تیغ کیا گیا اور قلمرو مظفریہ سلطنت تیمور کا باقاعدہ حصّہ بن گئی۔

قصوں میں یہ بیان ہُوا ہے کہ امیر تیمور حافظ سے بھی ملا اور اس ملاقات کے دوران میں تیمور نے حافظ کو اس شعر پر ٹوکا:

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ مارا
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

بعض جدید مؤرخین اور نقاد اس ملاقات کے امکان کی تردید کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ حافظ کا انتقال ۷۹۱ھ میں ہُوا اور تیمور ۷۹۵ھ میں وارد ایران ہُوا۔ لیکن جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں تیمور نے ایران پر پہلا حملہ ۷۸۹ھ میں کیا تھا۔ حافظ اس وقت زندہ تھے اور بظاہر یہ بات ناممکن نہیں کہ تیمور نے حافظ سے ملنے کی خواہش کی ہو جو یقیناً اپنے زمانہ کی مشہور و معروف شخصیت تھے۔

ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ حافظ کو منافقت اور مکاری سے کس قدر کد تھی اور ان لوگوں سے کس قدر نفرت تھی جو بہ ظاہر اپنے آپ کو محافظین دینِ متین کے رنگ میں پیش کرتے تھے اور جب خلوت میں پہنچتے تھے تو ان کی زندگی کا کچھ اور رنگ ہو جاتا تھا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ حافظ صوفی کی اصطلاح مکاروں اور عیاروں کے لئے استعمال کرتے ہیں خواہ ان کا تعلق زندگی کے کسی شعبہ سے ہو۔ اس اصطلاح کا یہ استعمال بغیر کسی شک و شبہ کے اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ حافظ کے زمانہ میں صوفی اپنے مقام بلند سے گر چکا تھا اور ہر شخص کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ جو لوگ اپنے آپ کو صوفی کہلواتے ہیں ان کے ہاں ہر قسم کی بے راہ روی کے نہ صرف آثار ملتے ہیں بلکہ اس کی ترغیب بھی دلائی جاتی ہے۔ یہ تصوّر کہ حسنِ مجازی صوفی کو اس عالمِ وجد میں پہنچا سکتا ہے جہاں حسنِ حقیقی اپنی تمام عظمت و جلال سمیت جلوہ افروز ہے، ایسا تھا کہ اس کی غلط تعبیر کی جا سکتی تھی۔ سعدی نے بھی اس بات سے خبردار کیا تھا لیکن کسی شخص نے کوئی توجہ نہ دی اور یہ نام نہاد صوفی ان تمام حرکات کے مرتکب ہوئے جو نہایت نفرت انگیز تھیں۔ اس سارے کاروبار کا زیادہ گھناؤنا

پہلو یہ ہے کہ یہ جنسی بے راہ روی کے شکار اس بات کے مدعی تھے کہ وہ صوفی ہیں اور ان کے دل پاک ہیں[1] اس لئے صوفی کا لفظ اس بات کا مستحق تھا کہ اسے وہ نئے معنی دئے جائیں جن میں حافظ نے مراد لئے ہیں۔ یہ بات بھی قرینِ قیاس ہے کہ مختلف گروہوں کے صوفیاء کے مابین جو مسابقت کا جذبہ کارفرما تھا اس کی بنا پر بھی یہ لفظ ذلیل ہو کر رہ گیا ہو۔ بہرحال یہ بات قطعی ہے کہ حافظ کے ہاں کسی شخص کی مذمت کے لئے صوفی سے بڑھ کر تیز لفظ کوئی نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ نکتہ دریافت کرنے کی داد پروفیسر نکلسن کو ملنا چاہئے جس نے قاموسِ مذہب و اخلاقیات میں ایرانی تصوف پر ایک فاضلانہ مقالہ لکھ کر اس بات کی توضیح کر دی ہے۔ یہاں چند ایک مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

بوئے یک رنگی ازیں وضع نمی آید خیز
دلق آلودۂ صوفی بمئ ناب بشوی

صوفی بیا کہ جامۂ سالوس برکشیم
وایں نقش زرق را خطِ بطلاں بسر کشیم

صوفی بیا کہ آئینہ صافیست جام را — تا بنگری صفائی مئی لعل فام را
رازِ درونِ پردہ ز رندانِ مست پرس — کایں حال نیست صوفیٔ عالی مقام را[2]

وہ قطعہ جس کا آغاز یوں ہوتا ہے:

صوفی نہاد دام و سرِ حقہ باز کرد

اس طنز کی بہترین مثال ہے اور اس میں اس بلّی کی طرف بھی اشارے کئے گئے ہیں جو نماز پڑھا کرتی تھی۔ اس بات کی مزید وضاحت غیر ضروری ہے کہ کلامِ حافظ کا ایک سرسری مطالعہ بھی قاری کو یقین دلا سکتا ہے کہ پروفیسر نکلسن نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ اس نے جس چیز کا سراغ دیا ہے وہ بڑی اہم ہے۔ اور پروفیسر نکلسن کے بیان کی روشنی میں حافظ کے بہت سے اشعار کے معانی کو از سرِنو معین کرنا ہوگا۔

حافظ تمام عمر تقریباً شیراز ہی میں رہا اور وہ اپنے مولد کو چھوڑنے سے ہمیشہ گریز ہی کرتے رہے لیکن تین موقعے ایسے درپیش آئے جب ان کو وطن کو خیرباد کہنا ہی پڑا۔

۱۔ ۷۶۶ھ میں وہ یزد گئے جہاں شاہ شجاع کے بھائی شاہ یحیٰی (۷۸۹-۷۹۵ھ) کا سکہ رواں تھا۔

---

[1] سعدی شیرازی کہتے ہیں: گرد ہی نشیند با خوش پسر — کہ ما پاک بازیم و اہلِ نظر

[2] بعض نسخوں میں یہاں زاہد کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں عماد کا ستارہ عروج پر تھا اور شاہ شجاع اس فقیہ کی باتوں میں آکر حافظ کی شاعری کو ہدفِ انتقاد بنانے لگ گیا تھا۔ اسی پر حافظ نے وہ غزل کہی جس کا مطلع ہے:

چہل سال بیش رفت کہ من لاف می زنم
کز چاکرانِ پیرِ مغاں کمترین منم

چونکہ حافظ کا سنِ ولادت ۷۲۶ھ ہے اس لئے اس غزل کا سالِ تصنیف ۷۶۶ھ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بعض دوسرے واقعات کو بھی باہم مربوط کر دیتا ہے۔ عماد نے ۷۷۳ھ میں انتقال کیا[1]۔ حافظ جب یزد پہنچے تو ان کا خیال تھا کہ ان کا شایانِ شان استقبال کیا جائے گا اور ان کے ورود یزد کو بڑی اہمیت دی جائے گی۔ لیکن شاہ یحییٰ نے حافظ کی کوئی پروانہ کی اور ان کو ایک قطعہ لکھنا پڑا جس میں بڑے واشگاف الفاظ میں وہ مدد کے طالب ہوئے ہیں:

دنی کہ چیست دولت دیدارِ یار دیدن — در کوئے او گدائی بر خسروی گزیدن
گوئی برفت حافظ از پادشاہ یحییٰ — یارب بیادش آور درویش پروریدن

حافظ نے اور بھی بہت سے اشعار کہہ کر بادشاہ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ مگر سب کوششیں اکارت گئیں۔ وہ بڑی مایوسی اور ناکامی کے عالم میں شیراز واپس آئے۔ واپسی میں اُنھوں نے نہایت عمدہ غزل لکھی جس میں اس واقعہ کا بھی ذکر ہے۔ یہ شعر اس میں شامل ہے:

عمرتان بادا مرادای ساقیانِ جامِ جم
گرچہ جامِ ما نہ شد پر می بدور انِ شما

۲۔ کچھ عرصہ بعد ۷۷۸ھ میں دکن کے سلطان محمود شاہ نے حافظ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی اور وہ دکن جانے کے ارادہ سے ہرمز تک گئے بھی۔ لیکن طوفان نے ان کو نہ صرف جہاز میں سوار ہونے سے روکا بلکہ اس کے بعد حافظ نے تمام عمر بحری سفر کا خیال بھی نہ کیا۔ انھوں نے سلطان محمود شاہ کو ایک بڑی اچھی غزل بھیج دی جس کا مطلع یہ ہے: دمی با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد
بمی بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد

---

[1] دیکھئے ادبیاتِ ایران بعہد مغولان ترجمہ داؤد رہبر صفحہ ۳۷۹

[2] جم جمشید کا مخفف ہے جو ایک دیوتا کا نام ہے اور ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے ہاں مشترک ہے۔ شید شیت یا شِت کے معنی عظیم، شاندار اور جلیل کے ہیں، مثلاً یہ مرکب دیکھئے خورشید = خور + شید یہاں خور یا ھور سورج کے لئے آیا ہے۔

۴۔ پژمان نے بیان کیا ہے کہ حافظ اصفہان بھی گئے اور انہوں نے کچھ عرصہ کے لئے وہاں قیام بھی کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصفہان میں کافی خوش رہے اگرچہ شیراز اصفہان سے بہتر نظر آیا:

اگرچہ زندہ رود آب حیات است   ولے شیراز ما از اصفہان بہ

حافظ کی نجی زندگی کے متعلق بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ ۵۔ پژمان کے قول کے مطابق ان کے دو بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک کم عمری میں مرگیا تھا۔ ان کی شادی بڑی کامیاب تھی مگر بدقسمتی سے ان کو اپنی منسوب بیوی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ اس کی وفات پر حافظ نے وہ غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے:

آں یار کزو خانہ ما جائے پری بود

سرتا قدمش چوں پری از عیب بری بود

اس مقالہ کا مقصد یہ ہے کہ حافظ کے کلام کی تنقید اور اس کی صحیح قدر و قیمت جانچنے کے لئے مواد مہیا کیا جائے۔ اور ان کے کلام کی ایک بنیادی خصوصیت ہے جسے مختصراً بیان کردینا مناسب ہے۔

تقریباً تمام ایرانی شاعر (استثنائی حالت بڑی مشکل ہی سے ملے گی) زندگی پر بالعموم قنوطی نگاہیں ڈالتے ہیں۔ حافظ کا کلام اس کے برعکس بڑی اہم استثنائی صورت پیش کرتا ہے۔ اور ان کے ہاں اکثر اوقات رجائی پہلو ملتا ہے اور ان کو اس بات کا یقین ہے کہ ہر واقعے کا انجام حسب دلخواہ ہوگا۔ اس بات نے حافظ اور ان کی شاعری کو فال بینوں کے ہاں بہت مقبول کیا کیونکہ حافظ کی پیشگوئیاں نوے فی صد خوش آیند ہونگی۔ ان کی بہت سی غزلیں اوّل سے آخر تک اُمید کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ چند غزلوں کے مطلعے پیش کئے جاتے ہیں:

رسید مژدہ کہ آمد بہار و سبزہ دمید   وظیفہ گر برسد مصرفش گل است و نبید

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند   چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور   کلبۂ احزاں شود روزی گلستاں غم مخور

ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ حافظ ان معنوں میں صوفی نہیں جن میں رومی اور عطار کو صوفی قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن ہرچند کہ ان کے ہاں متصوفانہ واردات نہیں ملتیں (ہمارا یہی خیال ہے)، پھر بھی وہ تصوف کی مصطلحات کو بڑے ماہرانہ انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے کلام حافظ کا کوئی تنقیدی جائزہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک ان کے کلام کے اس پہلو کو مدنظر نہ رکھا جائے اور اس کی نوعیت، قدر و قیمت اور اہمیت کو معین نہ کیا جائے۔